سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو شمارہ (۱۱۷)

ہندوستانی قومیت
کا
تمدنی پہلو

از

پروفیسر ایشور ٹوپا ڈی فل
جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد

سنہ ۱۹۴۵ء

قیمت (عہ ۲ ر)

مصنّف کی دیگر کتابیں

اُردو

تاریخ ہند (عہد قدیم)
ہندوستانی تمدن
اسرار حیات (آندھرا صوفی ویما کے تخیلات)

قومی مسئلے کی اہمیت

جو مسائل ملک کے سامنے درپیش ہیں ان میں سے ہندوستانی قومیت کا مسئلہ نہایت ہی نازک اور پیچیدہ ہے خصوصاً جبکہ اہلِ ملک قومی تشکیل کے درپے ہیں۔ لہذا سیاست اور تمدن کے باہمی تعلق کا تعین بے حد ضروری ہے۔ قومی مسئلے کی اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ایک ہی ملک کے مختلف لوگ ایک دوسرے سے قومیت کے رشتے میں منسلک ہونے کی کوشش کرتے ہوں۔ جدید ہندوستان بھی اسی کشمکش سے گزر رہا ہے۔ قومیت کے نظریوں کو پیش کرنا اس وقت بے سود ہوگا، کیونکہ وہ ہماری سیاسی الجھنوں کے دور کرنے میں مدد نہیں دے سکیں گے بلکہ ہمارے زاویۂ نگاہ کو محدود کردیں گے۔

ہمارا ماضی اور حال

ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا صحیح اندازہ لگانا اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ نئے زمانے

کی رفتار کے ساتھ چلنا اور قومی ضروریات کے مطابق اپنی زندگی کی پرانی قدروں کو نیا بنانے میں ہمیں حصہ لینا ہی ہوگا۔ ہمارا موجودہ زمانہ وہ نہیں ہے جو ہمارے پرانے طرز خیال اور ہماری قدیم زندگی کی روایتوں کو سمجھ سکے۔ زمانۂ ماضی جس کو ہم بے حد عزیز رکھتے ہیں اور زمانۂ حال جس سے ہم نہایت ہی خوف زدہ ہو رہے ہیں دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی ہے جس کا پاٹنا دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ ہم اپنی زندگی میں شعوری اور عقلی دنیاؤں کے تصادم کو برابر محسوس کر رہے ہیں۔ یعنی ہماری قدیم احساسی اور میل جول کی دنیا ہماری جدید ذہنی اور بظاہر استدلالی دنیا سے ٹکر کھا رہی ہے۔ اس طرح ہندوستانی زندگی کے اتحادی سیاسی اور سماجی عناصر برباد ہو رہے ہیں۔ اس طرح ہمارا مستقبل ایک ہیبت ناک خواب کی شکل میں ہماری نظروں کے سامنے پھر تا رہتا ہے۔ ہماری طبیعت کا یہ وہم اس وجہ سے پیدا نہیں ہوا کہ ہم میں قومی مسائل سے دو چار ہونے کی اہلیت باقی نہیں رہی ہے بلکہ ہم اپنے ماضی کے مردہ اصولوں کو ابھی تک اپنا زندہ ورثہ سمجھے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف ہم اپنے ذہنی قوت کی بنا پر جدید تر بننے کی کوشش کر رہے ہیں تو دوسری طرف ہماری قدامت پسندانہ فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ زمانۂ حال سے منہ موڑیں۔ اسی وجہ سے ہماری زندگیوں کے ماضی اور حال میں کوئی ہم آہنگی کا رشتہ جڑتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ ایک عام "جدید" ہندوستانی زندگی اور دنیا کے ترقی پذیر اصولوں پر عمل پیرا ہونے میں بڑی حد تک ناکامیاب ثابت ہو چکا ہے۔ ہمارے ذہن اور قلب نے ترقی کا آزادراستہ چھوڑ کر پرانی

کھوئی ہوئی راہ اختیار کر لی ہے۔ ہماری نفسیاتی زندگی میں ترقی کے سلسلے میں جو رکاوٹیں پڑ گئی ہیں وہ ہماری قومی ترقی کے مسئلے کو اور زیادہ مبہم کر دیتی ہیں۔ ہم میں نراجی اور غیر تشکیلی تصورات جاگزیں ہو گئے ہیں۔ اصل قومی معاملات سے بے اعتنائی اور غیر اتحادی رجحانات کی بنا پر ہمارا خیال و عمل پژمردہ ہو گیا ہے۔ ہماری زندگی میں حیاتیاتی قوتوں کا زائل ہونا بھی نظر آ رہا ہے۔ ہم اس امر سے غافل ہو گئے ہیں کہ سماج کی یہی حرکی قوتیں تعمیری تحریک کو فروغ دیتی ہیں۔ ہندوستانی مسئلے کا یہ پہلو ہمارے ہمدردانہ غور و فکر کا محتاج اس وجہ سے ہے کہ اس نے ایک نفسیاتی سماجی مسئلے کی اہمیت اختیار کر لی ہے۔

نیا زاویۂ نگاہ

ہمارے خیال میں آج اس بات کی بے حد ضرورت ہے کہ ہم اپنی سماج کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تاکہ ہندوستانی قومیت کے مسئلے کی گتھیاں سلجھ سکیں۔ اس طرح یہ امر بہت جلد عیاں ہو جائے گا کہ قومیت کے تخیل کی تشکیل میں چند بنیادی اصولوں کی مدد سے ہم اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو جذبۂ قومیت میں رنگ سکیں گے۔ ہم اس خیال کے عادی ہو رہے ہیں کہ ہندوستان بحیثیت مجموعی ایک قوم ہے یا ایک قوم کی حیثیت سے بن رہا ہے۔ اس خیال پر بحث کرنا کہ آیا یہ ایک حقیقت ہے یہاں مناسب نہیں لیکن جس نکتے پر ہم زیادہ زور دینا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ سماجی قوتوں اور قومی رجحانات نے ایک دوسرے کے تعلقات پر کیا اثر ڈالا اور ایک دوسرے میں کہاں تک ضم ہوئی اور ملک میں قومی تخیل کے اثرات کا دائرہ کس حد تک وسیع ہوا۔

سیاست اور تمدن کا تعلق

اگر سیاسی اور تمدنی محرکات کا کوئی باہمی تعلق کسی قوم کی ترقی کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے تو ہمیں اس بات کے کہنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا کہ ہندوستان کے مسلے کو اس خیال کے تحت دیکھنے اور جانچنے کی ضرورت ہے۔ اگر سیاسی اور تمدنی قوتوں کی ہم آہنگی ہندوستان میں ایک نئی دنیا کے پیدا کرنے میں مدد دے سکتی ہے تو موجودہ ہندوستان کو اپنی ان بنیادوں کو کھودنا پڑے گا جس پر وہ اپنی قومی زندگی کی عمارت کو کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس کے تمدنی طریق میں تبدیلی نہ ہو تو اس کی سیاسی حالت اور بھی بگڑ جائے گی۔ آجکل جو جدوجہد ملک میں جاری ہے وہ یا تو کلیتاً سیاسی ہے یا مذہب سیاسی روپ میں کارگر ہے۔ ملک کا مستقبل محض سیاسی عناصر کی بنیاد پر روشن نہیں ہو سکتا۔ اسی وجہ سے آج کا ہندوستان کل کے ہندوستان کو مختلف طریقوں سے خبردار کر رہا ہے۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کی افسوسناک حالت ایک بیماری کی طرح سماجی زندگی کو تیزی سے کھائی جا رہی ہے۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے ہمارے دل و دماغ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی زندگی کا یہ پہلو کیا حالیہ سیاسی دنیا کی قوتوں کے ردعمل کا نتیجہ ہے؟ یا ہندوستان ہمیشہ نراج کے حالت میں زندگی بسر کرتا رہا ہے؟ آیا یورپی تہذیب کی ٹکر سے ہندوستانی زندگی کے نظم و ترتیب میں خلل واقع ہوا، جس کی وجہ سے ہندوستان کا موجودہ مسلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے؟ یا یہ کہ تہذیبی تصادم کا مسلہ پرانے ہندوستان کو بھی ستاتا

رہا ہے؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے ہمیں لامحالہ تاریخی شہادتوں ہی پر اعتماد کرنا ہوگا، لیکن اس کے بعد بھی ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے کہ یہ تاریخی شہادتیں کس حد تک ہماری تحقیقی تشفی کا باعث بن سکتی ہیں اور ہماری تاریخ کا یہ فیصلہ کیا آخری تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں ہم صرف یہ کہیں گے کہ اگر ہم اپنے ماضی کو اچھی طرح سمجھ لیں تو اپنے آپ کو اس موجودہ دور میں بھی اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ماضی کی زندگی مستقبل کے ہندوستان کے لیے رہنما کا کام دے گی۔ جس طرح زمانۂ حال کا تعلق زمانۂ ماضی سے ہوتا ہے اسی طرح مستقبل حال سے منسلک ہے۔

تمدنی ترقی کا مسئلہ

کسی قوم کی زندگی کے اصولوں کا ارتقا اس وقت تک صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آ سکتا جب تک کہ اس کی سماجی، تمدنی، مذہبی اور سیاسی قوتوں کے باہمی میل اور اتحاد کے سلسلے کا سراغ نہ لگ سکے۔ ہمارے خیال میں اس بات سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا کہ آیا کوئی قوم سیاست کے میدان میں قدم آگے بڑھا چکی ہو اور سماجی اعتبار سے پیچھے ہو یا اس کے برعکس، لیکن یاد رکھنے کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ آیا اس کی زندگی میں سماجی، تمدنی، مذہبی اور سیاسی ربط کے عناصر میں خلل تو واقع نہیں ہوا یا ان کے باہمی تعلقات کہاں تک باقی رہ گئے ہیں۔ ترقی کا سوال وقت کا سوال ہے لیکن کسی قوم کی زندگی کا تمدنی سلسلہ اگر ٹوٹ جائے تو اس کی اصلی ترقی بھی رک جاتی ہے اور اس کو خطرناک راستے طے کرنے پڑتے ہیں۔ کسی قوم کا الٹے پاؤں چلنا کوئی آسان

کام نہیں، کیونکہ ہر قوم کی ساخت کا دارومدار اس کی تمدنی قوتوں کے اختلاطی اور مخفی احساسات پر ہے۔ لہٰذا قوم کی زندگی سے سیاسی اور سماجی برائیوں کو خارج کرنا بے حد دشوار ہے۔ ان دشواریوں کا دور کرنا اسی وقت آسان ہے جب کہ کوئی قوم مردہ اور بے حس قوتوں کا مرکب نہ بن چکی ہو۔ لیکن اس کی حیاتیاتی قوت اس سلسلے میں اور زیادہ پیچیدگی اور دشواری پیدا کر دیتی ہے کیونکہ برائیاں اور کمزوریاں محض عضویاتی ہی نہیں، بلکہ نفسیاتی بھی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص مرض کی تشخیص اس اصول کو نظر انداز کرکے کرتا ہے تو اس کا یہ فعل احمقانہ تصور کیا جائے گا۔ صحیح تشخیص نصف شفا کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ انسانی امراض اور سماجی امراض میں دراصل کوئی بنیادی فرق نہیں بلکہ دونوں کی نوعیت ایک ہی سی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا طریق علاج ایک ہی سا ہونا چاہیے۔ معلم اخلاق اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ انسان یا سماج کی زندگی کا نفسیاتی پہلو بھی ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ بیماریاں انسانی ہوں یا سماجی جسمانی یا طبعی کمزوری سے وجود میں آتی ہیں، لیکن اس کا کیا جواب جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ طبعی اور احساسی محرکات کے ردِعمل کے تحت انسان انفرادی اور اجتماعی روش میں مرضیاتی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان اور سماج کی برائیوں کے علاج میں وسعت نظر سے کام لینا چاہیے۔ ایسا نہ کیا گیا تو کامل شفا کی توقع نہیں۔ اس لیے ایک ایسے طرز خیال و فکر کی ضرورت ہے جو مرض کے اسباب کی کھوج ہر پہلو سے رکھے۔ اسی طرح ہمارے قومی مسلے پر ہر پہلو سے روشنی پڑنی چاہیے۔

تاریخی پس منظر

یہ تو ایک مسلمہ امر ہے کہ آجکل ہندوستان تمدنی، سیاسی اور سماجی بے ترتیبی اور بے آہنگی کی وجہ سے تکلیف پر تکلیف اُٹھا رہا ہے، جس میں اس کی گزشتہ تاریخ کی غلط بیانیاں بھی شامل ہیں جو قومی تخیل اور قومی نشوونما میں حائل ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ یہ مسلہ اس وقت تک صاف نہ ہو سکے گا جب تک کہ تاریخ کی روشنی میں قدیم ہندوستان اور جدید ہندوستان کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ ماضی اور حال کے ہندوستان کے موضوع پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم اپنے خیالات پیش کریں گے تاکہ ہندوستان کی گزشتہ تاریخ کے واقعات کو تاریکی سے نکال کر عام ہندوستانی تمدن کے نشوونما میں ان کی اہمیت کا پتہ چل سکے۔ اس ضمن میں اس امر پر بھی زور دیا جائے گا کہ عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کا ہندوستان، ہندوستانی قومیت کے مسئلے کو حل کرنے میں کس حد تک محرک بنا رہا ہے، کیونکہ وہ زمانہ اہل ہند کی زندگی کو قومی بنانے میں مصروف رہا تھا۔ ہندوستانی قومیت کی عمارت جس اصل بنیاد پر اُٹھائی جا سکتی ہے اس کا سراغ ملک کی گزشتہ تاریخ کے ماسوا کہیں نہیں ملتا۔

۲

عہدِ قدیم کے تمدّنی رجحانات

سماجی نظام کا اصول

قدیم ہندوستان نے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں اپنی تہذیب کو کسی اور ہی انداز پر چلایا تھا۔ اس کے سیاسی سماجی مفکرین کی کوشش ان اصولوں کی تلاش میں لگی ہوئی تھی جن کی بنا پر سماج کے نظام میں استحکام پیدا ہو سکے۔ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے ان کو ایک طویل عرصہ لگا۔ ان کے نزدیک انسانی ترقی دھرمی اصولوں میں مضمر ہے۔ دھرم جس کے نام سے لوگوں کے دلوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، اپنے میں بڑی لوچدار خصوصیت رکھتا ہے۔ اس سے طرح طرح کا مفہوم لیا جاتا ہے اور اس میں تشریح اور توضیح کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں وہ امدادی اور تردیدی اصولوں کا بھی مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعض وقت دھرم کا اصول مختلف لوگوں کے، مختلف سماجی قانون کے تحفظ کا اصول ہے۔ بعض مرتبہ ایک خاص طریقۂ زندگی کی قانون بندی میں

وہ اپنا ظہور دیکھتا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی اصول کی پابندی بھی سختی سے برتنا دھرم ہے۔ دھرم اس کو بھی کہتے ہیں کہ سماج میں انفرادی اور اجتماعی رشتے کے توازن کو برقرار رکھا جائے، تاکہ لوگوں یا فرقوں کی زندگی میں اتحاد اور عمل پیدا ہو سکے۔ دھرم سے یہ بھی مراد ہے کہ سیاسی قوت کو کامل اختیار دے کر مخالف سماجی تحریکوں کا قلع قمع کر دیا جائے تاکہ سیاسی اور سماجی زندگی کی بڑھتی بنیادیں خطرے میں نہ پڑ سکیں۔ اس طرح دھرمی اصول کی وسعت اور اس کا دائرۂ اثر ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں تک انسان اور سماج کی سرگرمیاں اس سے متاثر ہوتی رہیں۔ انسان کا آزادانہ تخیل اور عمل اسی وجہ سے غیر حرکی ہو گیا لیکن سماجی نظام کو اس حد تک آزادی نصیب ہوئی کہ وہ دھارمی اصولوں کو اپنے سامنے رکھ کر اپنی سرگرمیوں میں منہمک رہے۔ اس طرح خدا کا نازل کردہ سماج کا حکمرانی نظام قائم کیا گیا اور دھرمی اصول عملی جامہ پہن کر انسان کی رہنمائی کرتے رہے۔ وہ اپنی منظم گروہی زندگی کے اصولوں پر کاربند رہے اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کا خیال ملحوظ رکھا کہ سماج کے مختلف طبقے جو منشار الٰہی کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں آپس کے باہمی تعلقات کو برقرار رکھتے ہوئے عمل اور اتحاد پیدا کریں۔ فسادی اور نزاعی قوتوں کو ہر صورت میں اور ہر موقع پر برباد کیا جائے۔ سماجی گروہ کے آپس میں مختلف تعلقات اور روابط ہم آہنگی اور اتحاد کے اصولوں پر قائم کیے گئے تھے، تاکہ سماجی اتحاد ہر ممکنہ طریقے سے اصل تصور کیا جا سکے۔ مفکرین نے

مختلف زمانوں کے لیے مختلف نوعیتوں کے سماجی نظام ترتیب دیے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب اسی اصول پر مبنی تھے کہ ایک عالمگیر سماجی نظام کے تحت تمام گروہی وحدتوں کو ایک ہی اصول کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔

سماجی تحریکوں کی اہمیت

یہ تمام تحریکیں کم و بیش سماجی نوعیت کی تھیں۔ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے ان میں ترقی پذیر اور قدامت پسند اصول پوشیدہ تھے۔ انسان کا مقام سماج میں بدھ مت کے ترقی پذیر اصول کا ایک محوری نقطہ تھا، لیکن برہمنی دھرم کا قدامت پسند اصول ہمہ گیر سماج کو اپنی جان سمجھتا تھا۔ بدھی تحریک کا یہ نتیجہ تھا کہ لوگوں کے دل و دماغ میں غیر سماجی ردعمل یا رجحان پیدا ہوا اور اس نے یہ بتلایا کہ انسان بحیثیت ایک ہستی کے اپنی قسمت کا بنانے والا ہے، نہ کہ دیوتا اور برہمنی قانون کے وہ تابع ہے۔ اس بدھی تخیل نے انسان کے حوصلے اس حد تک بڑھا دیے تھے کہ وہ اس تازہ اور شفاف ہوا کو لے جو برہمنیت کے گندے جذبات سے پاک تھی۔ بدھی تحریک انسانی نقطۂ نظر سے خلاف سماجی نہ تھی بلکہ برہمنی اعتبار سے غیر سماجی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان حیات کے اساسی اصول کی کھوج میں منہمک رہے۔ بدھی تحریک کی کوشش یہ بھی رہی تھی کہ خلاف برہمنی قدروں پر ایک نئے سماج کا قیام ہو، تاکہ ہندوستانی دنیا میں انسان آزادانہ طور پر سماج کی رکنیت حاصل کرے اور اس طرح سماجی استحاد کا مسلک نظر سے اوجھل نہ ہو سکے۔

برہمنی تحریک کا قدامت پسند استحادی اصول

ہندوستان میں اور بھی ایسی حرکی

تحریکیں سماج میں چلیں جن سے لوگوں کی زندگی متاثر ہوئی۔ برہمنی تحریک کے احیا کے مختلف دوروں میں زندگی کی تمدنی قدروں میں اضافہ ہوتا گیا، گو وہ اپنی ظاہری طرز اور روش میں زمانے کے ساتھ تبدیل ہو چکی تھی لیکن درحقیقت برہمنیت کے قدیم جذبات اور اصولوں کی حامی رہی۔ اس کو ہمہ گیر سماج میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں اتنی کامیابی حاصل نہ ہوئی جتنی کہ سماج کی نراجی قوتوں کے برباد کرنے میں، اس موقع پر اس سوال کی موزونیت واجب معلوم ہوتی ہے کہ آیا ہندوستان کے لوگوں کی زندگی میں برہمنیت کا بنیادی اصول ترقی پذیر تھا یا اس نے ہندوستانی زندگی کے سرچشمے کو جان بوجھ کر زہر آلودہ کیا اور ہندی زندگی کی بے رونقی میں غیر رومانی اور میکانی اثرات کا اضافہ کیا۔ اس کے متعلق صرف اتنا کہنا یہاں مناسب ہے کہ اس کا مسلک یہ تھا کہ سماج کی بنیادیں اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتیں جب تک کہ سماجی زندگی سے غیر اتحادی عناصر کو خارج نہ کیا جائے۔ اس طریقے سے ایک قسم کی تہذیبی کوشش کی گئی کہ لوگوں کی زندگی برہمنی اصول کے تحت اتحادی قوتوں کو فروغ دیتی رہے۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ ماضی کے ہندوستان نے شعوری طور پر ملک کی تمدنی قوتوں کے آپس کا میل جول پیدا کیا، بلکہ جو کامیابی اس کو نصیب ہوئی وہ حقیقت میں یہ تھی کہ انسان کی خود مرکزی گروہی زندگی کے قانون اور روایات کا تحفظ کیا، تاکہ انسان اور اس کے گروہ کی سرگرمیوں میں ربط قائم رہے۔ اس کے علاوہ اس بات میں بھی کامیابی حاصل رہی کہ ہمہ گیر سماج کی نگرانی کی وجہ سے گروہی احساسات اور جذبات

برہمنیت سے قریب تر ہونے لگے۔ برہمنی تسلط کی پہلی کوشش ملک کے اصلی باشندوں کی تہذیب کو فنا کرنے کی تھی، لیکن اس کو وہ برباد نہ کر سکے۔ برہمنیت نے آخرش مجبور ہو کر ان کی تہذیب کی جبلی قوتوں کو تسلیم کیا اور ان کی تہذیب سے ایک "غیر احترامی اتحاد" کا رشتہ پیدا کیا۔ اسطرح غیر برہمنی تمدن برہمنی تمدن میں پیوست ہونے لگا اور اس کا اثر برہمنیت کے نظریوں اور اصولوں پر پڑا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ عمل اور ردِ عمل ایک فطری امر ہے۔ جو اہل ملک کی زندگی میں اکثر و بیشتر رونما ہوتا ہے۔

ذات کی مرکزیت

قدیم ہندوستان کے لوگوں کی تمدنی استواری میں جو عنصر کام کر رہا تھا وہ ذات کا ادارہ تھا۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ بجائے انتشار کے اس ادارے نے مرکزیت کے اصول کو اپنا سنگ بنیاد قرار دیا تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ ذات کیا ہے؟ اور اس نے ہندوستان میں زندگی کی فرحت بخش قوتوں کو کس طرح پیدا کیا؟ یہ کیونکر ممکن ہوا کہ ایک طرف تو ذات سماج میں حد بندیاں قائم کرتی گئی اور دوسری طرف گروہی وحدتوں میں اتحاد پیدا کرتی رہی۔ بظاہر تو یہ متضاد کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ذات بحیثیت ایک سماجی حکمرانی ادارے کے کچھ تو نسلی عداوت اور کچھ خود مرکزی گروہی تنظیموں کی تعمیری قوت اور حیثیت کا نتیجہ تھی۔ ان دو عناصر نے شعوری طور پر ذات کے ادارے کو پیدا کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آریا اپنی نسلی برتری اور تہذیب کو ذات کے ذریعے برقرار رکھنے کی کوشش میں کامیاب ہوئے لیکن غیر آریا عنصر کو ہمہ گیر

سماجی زندگی میں دخل انداز ہونے کی اجازت مجبوراً دی گئی۔ یہ امر اس زمانے
کی تعمیری ذہنیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ آریوں کا یہ رویہ غیر آریوں کی حد
تک ان کے اس خیال اور یقین کی محض ایک علامت ہے کہ غیر آریا دشمنوں کی
تو تہذیب ہے اس میں زیادہ قوت حیات موجود تھی جو کبھی تباہ نہیں کی جا سکتی
تھی۔ اگرچہ کہ آریوں نے اپنی سماج میں غیر آریوں کو شریک ہونے کی اجازت
دی تھی (گو ان کو بہت ہی گرا ہوا مرتبہ عطا کیا گیا) تاہم اس طرح زندہ رہو
اور زندہ رہنے دو کا اصول عمل میں آیا۔ یہ صحیح ہے کہ آریوں نے غیر آریوں سے
اپنی ہی من مانے شرائط منوائے جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ آریائی تمدن کو فوقیت
حاصل رہے اور اس طرح آریا اپنی تہذیب کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو
غیر آریاؤں سے تسلیم کروا سکیں۔

آریائی اور غیر آریائی میل

آریا مفکرین نے نہ صرف یہ کوشش کی کہ غیر آریوں کے ساتھ مناسب یا غیر مناسب سمجھوتے
کئے جائیں (جب کہ آریوں اور ان کے درمیان نسلی میل جول ایک حقیقت
بن چکی تھی) بلکہ ان لوگوں کو آریائیت کے زمرے میں داخل ہونے کی دعوت دی
جو آریوں کے قریب تر آ چکے تھے۔ چنانچہ آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے وہ
نے سماجی قوانین کی نشانیاں موجود ہیں جو خالص آریائی تخیلات کی سماجی
ں اور مختلف گروہی تنظیموں کے سماجی قوانین کے باہمی ربط اور ملاپ کا
نہیں، لیکن جو چیز کہ ہندوؤں کے ان تمام سماجی مذہبی قوانین میں زیادہ
ں ہے وہ آریائی چھاپ، آریائی اثر، آریائی تخیل اور طرز حیات ہے۔

اس طرح آریائی ذہنیت نے غیر اتحادی سماجی قوتوں میں ہم آہنگی پیدا کردی
جس کا نتیجہ سماج میں استواری اور اتحاد تھا۔

ذات کا قانون اور سماج

ذات ایک سماجی حکومتی ادارے کی شکل میں (علاوہ اس کے کہ وہ گروہ کی زندگی کے اتحاد کو برقرار رکھتی ہے) آریائی اور غیر آریائی تمدنوں کے باہمی تعلق کو مضبوط کرنے میں مدد دیتی رہی ہے۔ آریا تسلط کو تسلیم کرنے کے بعد گروہوں کو اپنی روایات کے بموجب زندگی بسر کرنے کی آزادی نصیب ہوئی۔ اس طور سے ذات ایک قوت محرکہ کی حیثیت سے گروہی زندگی کی اور گروہوں کے باہمی تعلقات کی نگہداشت کرتی رہی اور آریاؤں نے اپنے اخلاقی اصول کے تحت سماجی سرگرمیوں کو محدود کرنے کی کوشش کی۔ سماج کے مقررہ فرائض کا احساس پیدا کرانا ذات کا اہم کارنامہ رہا اور اس کی یہ نمایاں خصوصیت بھی تھی۔ صرف یہی سبب ہے کہ ذات بجائے اس کے کہ لوگوں کی زندگیوں میں خلل ڈالے، سماج کی زندگی کی بنیاد کو مستحکم کرتی رہی۔

ذات کے نظام کی خصوصیت

ذات کے نظام میں فرائض کے مقابلے میں حقوق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سماج نے ذات کو کوئی ایسا حق دیا کہ وہ اپنے کو سماج سے علیحدہ کرلے۔ ذات کو یہ حق بھی نہیں دیا گیا کہ وہ جو چاہے کرے اور من مانے طور سے پیش آئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سماج میں انتشاری عناصر زائل ہوتے گئے یعنی آریوں اور غیر آریوں میں اتحاد و اتفاق بڑھتا گیا۔ غیر آریا گروہ کے ماتحتانہ رجحا

نے ان کو بے دم کر دیا۔ لہذا ذات فرقہ واریت کے پیدا کرنے میں رکاوٹ کا باعث بنی اور جب کہیں ایسے خیالات یا محرکات ظہور پذیر ہوئے تو ذات نے فرقہ واریت کا مقابلہ کرکے فرقہ واری اثرات کو زائل کر دیا۔ ذات نے ان قوتوں کے خلاف بھی جنگ کی جو سماج کو ایک زندہ مگر غیر امتیازی نظام حیات میں تبدیل کر رہے تھے۔ لہذا ذات کے ادارے کی وجہ سے قومیت کی تشکیل میں کسی قسم کی مدد نہیں ملی۔ یہ ذات کے اصول اور مقصد کی اہمیت تھی۔

ذات کی بقا کا سوال

ذات کا سماجی اور حکومتی ادارہ صرف دو حیثیتوں سے باقی رہ سکتا ہے۔ اول تو یہ کہ گروہی زندگی اور اس کے نظام کو ہمہ گیر سماجی قوانین کی سختی کی بنا پر برقرار رکھا جا سکتا ہے اور دوسرے یہ کہ گروہی وحدتوں کا تعلق آریائی مذہب، آریائی اخلاق اور آریائی فلسفہ حیات سے منوایا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان نے بڑی حد تک ایسے تمدنی رشتوں کو قایم کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ مگر اس وقت جو اہم سوال ہمارے پیش نظر ہے وہ یہ کہ حالیہ ہندوستان قدیم مفکرین کی آنکھوں سے کہاں تک دیکھ سکتا ہے۔ اس سوال کا جواب اس پر منحصر ہے کہ آیا ذات کا پر اسرار پہلو جدید زمانے کے حکمی اور عقلی نظریوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ ذات کی "حیات" کا سوال ان دونوں اصولوں کے بقا پر منحصر ہے جن کا ذکر ہم ابھی کر آئے ہیں۔ ان میں سے اگر ایک بھی خطرے میں پڑ جائے تو ذات خود خطرے میں پڑ جائے گی۔ زمانے میں برباد اور تعمیر کرنے کی قوت موجود ہوتی ہے۔ حالیہ ہندوستان میں ذات کا ایک ستون ٹوٹ رہا ہے اور

اور اس کا گر جانا صرف وقت کا سوال ہے۔ سماج کو ایک دن اپنے پرانے اداروں سے رخصت ہی ہونا ہوگا، گو پرانے زمانے میں سماجی توتوں کے توازن کے قائم کرنے میں اس کی خدمات نمایاں رہیں۔ وقت اور زمانہ دنیا کے نظام کو تبدیل کرتا ہے اور سماج اور انسان ان کے ہاتھوں نئے طور پر تہذیب بھی پاتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوا اور ہو رہا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم مردوں کی طرح لڑنے کے لیے تیار رہوں اور ان چیزوں کو اپنی زندگی سے نکال پھینکیں، جو اپنی اصلی قدر و قیمت اور ضرورت کو کھو چکی ہیں۔ اگر مردہ سماجی ادارے زندہ تصور کیے جانے لگیں تو سماج میں ایک آفت برپا رہے گی۔ ان کو جس قدر جلد دور کیا جائے اتنا ہی ہماری انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے لیے مفید ہوگا۔ ان کے برقرار رکھنے کے لیے جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں وہ دراصل بے سود ہیں، کیونکہ ان کی وجہ سے سماج کا مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جائے گا۔ منطق اور فلسفہ کی تمام طاقتیں مردہ سماجی جسم میں جان نہیں ڈال سکتیں۔ اگر ذات کو زندہ رہنا ہی ہے تو اسے یہ کرنا چاہیے کہ وہ مذکورۂ بالا اصولوں پر کاربند رہے لیکن ایسا ہونا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے کیونکہ سائنٹفک نظریۂ زندگی نے ان اداروں کی پُر اسرار نوعیت کی حقیقت کو فاش کر دیا ہے۔ زمانۂ حال قوم سازی کے رجحانوں سے مملو ہے اور ان کی سماجی حیثیت کے متعلق اپنے نئے خیالات کا پرچار کر چکا ہے۔ اس نے ذمہ داری کے نئے احساس کی اہمیت کو نہ صرف انفرادی زندگی ہی میں بلکہ اجتماعی زندگی میں بھی بتا دیا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ زندگی

اور دنیا کے متعلق انسان کی نظر میں بہت وسعت پیدا ہو چکی ہے اور بجائے
اس کے کہ انسان ذات کے دباؤ میں زندگی بسر کرے وہ انسانیت کے وسیع
تخیل میں اپنی زندگی کے مقصد کو پورا ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے
کہ ہندوستانی انسان کب تک اپنے تخیل اور عمل کے مطابق ایک طرف تو
ذات کے دباؤ میں رہے گا اور دوسری طرف اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا رہے گا
کہ وہ قومیت کو بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ اس وقت کے مفکرین انہیں خیالات میں
سرگرداں ہیں۔ ان کے سامنے یہ بہت بڑا سوال ہے جس کو مستقبل ہی حل کریگا۔
اگر حالات کا مقابلہ مردانہ طور سے کیا گیا تو تکلیف بہت کم ہوگی لیکن اگر ان ہیں
یوں ہی چھوڑ دیا گیا تو ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ کسی نشتر کے بغیر معاملہ
سلجھ نہ سکے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے سماج اور سیاست میں زہر پھیلتا
جا رہا ہے۔

رواداری کا اصول

قدیم ہندوستان کے بنیادی اصولوں نے سماج
میں اتفاق اور اتحاد کو قائم رکھا۔ اس کی وجہ سے
ایک خاص قسم کی ذہنیت کا نشوونما ہوا جس پر قدیم ہندوستان کو فخر تھا۔
اسی ذہنیت نے سماجی پیچیدگیوں کو بہت کچھ سلجھا دیا تھا۔ وہ اصل میں رواداری
کا احساس تھا جس کی باقاعدہ تربیت کی گئی تھی۔ رواداری سماجی دباؤ
اور جبر کا نتیجہ نہ تھی بلکہ لوگوں کی زندگیوں کی امتزاجی اسپرٹ کی تربیت تھی۔
رہو اور رہنے دو کے خیال نے آپس میں سمجھوتے کی ذہنیت پیدا کردی تھی۔
بالفاظ دیگر باہمی رواداری کو اس طرح تقویت دی گئی کہ سماجی زندگی میں

ہر ایک گروہ کی انفرادی زندگی کو ایک زندہ ہستی سمجھ کر اور گروہوں کے آپس کے تعلقات کو سماجی نقطۂ نظر سے معین کر کے تسلیم کیا گیا تھا۔ قدیم ہندوستان نے اپنی تہذیب کی نشوونما سماجی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مخصوص اصولوں پر کی تھی۔ اس کو اس اعتبار سے حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو اُن بدلنے والی ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ ہمیشہ مربوط رکھا ایسی تبدیلی نے سماج کے اصولوں پر آنچ نہ آنے دی۔ کیونکہ سماج کی وحدتوں کے قیام اور تحفظ کا سوال اس کا اولین فرض قرار دیا گیا تھا۔ یہاں تک ہم کو قدیم ہندوستان کے مفکرین کے سماجی فلسفے سے واقفیت حاصل ہوئی کہ ان کا نصب العین اور طرز تخیل کس طرح عملی جامہ پہن سکا۔

۳

عہدِ وسطیٰ کا تمدنی مسئلہ

ہندی اسلامی عہد کے متعلق غلط فہمیاں

اب ہم ہندوستان کے ایک دوسرے دور کا ذکر کرتے ہیں جو بمقابلہ قدیم کے ہم ہندوستانیوں سے قریب تر عہد ہے۔ یہ دور نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ سبق آموز بھی ہے۔ اس ضمن میں یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ہمارے ملک کی تاریخ کا یہ وہ عہد ہے جس کی اہمیت اور قدر خاطر خواہ طور پر سمجھی نہیں گئی اور جو غلط فہمیوں کا شکار بنا رہا۔ یہ شکوک اور غلط فہمیاں اس زمانے کے متعلق ہیں جو ہماری تاریخ کا ہندی اسلامی دور ہے۔ ان کے وجود میں آنے کے متعدد اسباب ہیں۔ قبل اس کے کہ اس دور کے ہندوستان کی اہم خصوصیتوں کا خاکہ کھینچا جائے یہ بہتر ہوگا کہ ان غلط فہمیوں اور شکوک کو رفع کیا جائے تاکہ اس دور کے مسائل صحیح طور سے سمجھ میں آسکیں۔ لوگوں کو اس امر کا یقین دلایا گیا کہ راج کی ابتدا سے ہندوستان کی بدبختی کے دن شروع ہوئے اور جو

مسلمان فاتح کی حیثیت سے ہندوستان آے ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں آگ۔ انھوں نے ہندی تمدن کی مقدس بنیادوں کو اُکھیڑ پھینکا، ملک کو تاخت وتاراج کرکے آبادی کو تہ تیغ کردیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلم تسلط کی بنیاد ظلم، استبداد، ضبطی، خونریزی اور اہل ملک کے مقدس مقامات کی بے حرمتی پر رکھی گئی تھی۔

تاریخی حقایق سے چشم پوشی

اس بات کے معلوم کرنے کی اب تک بہت ہی کم کوشش کی گئی ہے کہ اسلامی اور ہندی تہذیبوں کے باہمی میل جول سے کیا خوشگوار نتائج برآمد ہوے۔ ہندوستان کی تاریخ کے پڑھنے سے جو دل خراش اثر پیدا ہوتا ہے اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ تاریخ ایک خاص سانچے میں ڈھال کر پیش کی گئی ہے بلکہ اسلامی اصول کی قدر شناسی سے گریز کیا گیا ہے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ان بنیادی اُصولوں کے سمجھنے کی کوئی صحیح کوشش نہیں کی گئی جن پر اسلامی مملکت اور سماج کا نشو ونما ہوا تھا۔ ہماری انتہائی بدنصیبی یہ ہے کہ ہندوستانی مورخین کی ذہنیت کی بڑی خرابی یہ رہی کہ واقعات کے بیان میں ان کی خیال آرائیوں کا حد سے زیادہ دخل رہا ہے اور بغیر کسی تاریخی مواد یا شہادت کے من مانے نتائج اخذ کرتے گئے ہیں۔ خاص واقعات کو عام بنا کر اچھالنا ان کی فطرت سی ہوگئی ہے۔ ہندی اسلامی حکومت کے متعلق تاریخی واقعات کی توڑ مروڑ یا جھوٹی تہمت اور ذلیل اغراض کے باعث تحریف سے لوگوں کے دلوں میں سخت غلط فہمیاں

جگہ کر گئی ہیں۔

مورخ اور زمانہ

مورخ بحیثیت انسان کے اپنے زمانے کی اسپرٹ کا نمونہ ہوتا ہے۔ جس زمانے میں ایسی تاریخیں لکھی گئیں ان پر اس زمانے کا اثر نمایاں تھا۔ اسی خیال کو عام الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ مورخین کے دل و دماغ پر زمانے کی عمرانی قوتوں کا چھاپہ پڑتا ہے۔

وقت اور زمانہ تخیلی قوتوں کی شکل میں نمودار ہو کر لوگوں کی زندگی کو بناتا اور بگاڑتا بھی رہتا ہے۔ ہندوستان کے مورخین بھی اسی طرح جدید ہندوستان کی ان نراجی قوتوں سے متاثر ہوئے جو اپنے قدیم تمدنی تعلقات سے علیحدہ ہو چکی تھیں۔ ہندوستانی مورخ کا فرقہ وارانہ رجحان اس عمل کا نتیجہ ہے جو لوگوں کی تمدنی زندگی میں پیدا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ زمانے کی روح کو غلط سمجھ کر اور ماضی کے متعلق جھوٹی تمدنی قدروں کو پیش کر کے ملک میں فرقہ واری خیال کو وسعت دیتا رہا۔ علاوہ اس کے اس نوعیت کی تاریخ لکھنے میں نہ صرف ایک خاص قسم کا سیاسی مقصد حاصل ہوا بلکہ اس کے دیگر وجوہ بھی تھے جن کی بدولت بدگمانیوں میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو گیا۔

جھوٹی کسوٹیاں

ہندوستان کی مسلم حکومت کے متعلق جو سب سے بڑی غلط فہمی پیدا ہوئی وہ اس میں پوشیدہ ہے کہ مورخین نے مذہبی اغراض کو سیاسی واقعات میں سمو دیا۔ ہندوستانی مورخین نے عہد وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کی قدر و قیمت کو جس کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی ہے

وہ یا تو ٹھیٹ ہندو ہے یا مسلم۔ دونوں صورتوں میں بے حد تنگ اور محدود ہے اور یہی تاریخ کے معیار کی سب سے بڑی خامی ہے۔ زمانہ وسطیٰ کی جانچ پڑتال کچھ تو اُس زمانے کے اُصول حیات کے صحیح اندازے سے ہو سکتی ہے اور کچھ انسانی برتاو کی بنا پر اس دور کی بڑی بڑی شخصیتوں کے حالات اور کارناموں کو سمجھا جا سکتا ہے۔ زمانہ وسطیٰ کی کل زندگی اپنی روح اور روپ میں درحقیقت وسطانی تھی۔ اگر وسطانی چیزیں جدید معیاروں سے جانچی جائیں تو ہمیں مجبوراً وسطانی زندگی کی رُوش اور چلن کو بھی جدید اسپرٹ میں سمجھنا پڑے گا جو حقیقت میں وسطانی روح اور زندگی کی سچی نفسیاتی آئینہ داری نہ ہوگی۔ لہٰذا اس بات کی ضرورت ہے کہ وسطانی ہندوستان کے سمجھنے کے لیے اسی زمانے کے سیاسی اور تمدنی پیمانوں سے کام لیا جائے۔ صاف الفاظ میں یوں سمجھیے کہ ہندوستان کے بلند پایہ مسلم حکمرانوں کی قلبی اور ذہنی کاوشوں کو ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کرنے میں ہندوستانی مورخین ناکام رہے کیونکہ انھوں نے زمانہ وسطیٰ کی سیاسی اور سماجی زندگی کے ادراک اور فہم کے لیے غلط معیاروں کا استعمال کیا اور ماضی کے مذہبی، سیاسی اور سماجی حالات اور کیفیات کو اپنے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی، نہ کہ اس وسطانی زمانے کے اعلیٰ حکمرانوں اور لوگوں کی نظروں سے۔

تاریخ کی صداقت اور اس کا فریب

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ تاریخ بعض اوقات جھٹلایا ہوا سچ ہوتی ہے اور بعض اوقات خودغرضی اور بدنیتی سے جھوٹ کو سچ بنا کر

تاریخ کو مرتب کیا جاتا ہے ۔ اس طرح تاریخ مورخین کے نا اہل ہاتھوں میں ایک خطرناک ہتھیار کا کام دیتی ہے ۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ آرٹ کے شاہکار کے دیکھنے، سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے فن کار کا دل، اس کی آنکھ، اس کے نفسیاتی جذبات اپنے میں پیدا کرنے پڑتے ہیں ۔ یہی اصول تاریخ پر منطبق ہوتا ہے ۔ اس کے سمجھنے کے لیے اسی زمانے کی آنکھ، اسی زمانے کا دل اور اسی زمانے کے جذبات کا ہونا مقدم ہے ۔ ہر مورخ کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ تاریخ کا مطالعہ اسی اصول کے تحت کرے ہمارے ملک کی تاریخ ایک واقعہ نگاری کا انبار ہو کر رہ گئی ہے کیونکہ ہمارے مورخین میں ہمدردی اور قدرشناسی کے جذبے کا فقدان رہا ہے ۔

فرقہ واریت اور ہماری تاریخ

اگر ہندوستان کی تاریخ ان نقائص سے مبرا ہوتی تو اس ملک کی تاریخ کا نئے سرے سے لکھنا کوئی مشکل امر نہ ہوتا، لیکن موجودہ فرقہ داری تاریخ کی وجہ سے ملک کو بڑا نقصان پہنچا ہے ۔ ملک کے مختلف لوگوں کے مطمح نظر کا ایک دوسرے پر جو اثر پڑا تھا اس کو سمجھنے اور اس کی قدر کرنے سے ہم قاصر ہو گئے ہیں ۔ لہذا تاریخ کا صحیح طور سے اور صحیح اسپرٹ میں لکھنا تاکہ ہمارا ملک ترقی کی راہ لگ سکے جدید ہندوستان کا اہم ترین مسئلہ ہے ۔ نئی تاریخ کی قدر و قیمت اس پر منحصر ہو گی کہ وہ کس اسپرٹ کے ساتھ لکھی جائے گی ۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہندوستان کا مستقبل آج کل کے مورخین کے ہاتھ میں ہے ۔ ان کی ذمہ داری بہت ہی عظیم ہے کیونکہ ان کے فرقہ واری

خیال نے لوگوں کی زندگی کو غیر تمدنی و اتحادی جذبات سے متاثر کیا ہے۔ لہٰذا اس کا تدارک لازمی ہے۔ آج کا ہندوستان اگر ایک روشن مستقبل کا خواہشمند ہے تو اسے تاریخی غلط فہمیوں کے مسلے سے دوچار ہی ہونا پڑے گا۔ جتنا جلد ہندوستان اس تاریخی تحقیق کے سوال کو انہماک کے ساتھ اٹھائے اتنی ہی اس کی آیندہ زندگی بہتر بن سکے گی۔ حالات ایسے پیدا ہو رہے ہیں کہ اگر تاریخ کے ان تباہ کن اثرات کو بڑھنے اور پھیلنے دیا گیا تو سماج اور ملک آیندہ خطرات سے بچ سکے گا۔ تاہم سب کی کوشش ہونی چاہیے کہ اس حادثے سے ہندوستان کو بچائیں۔

مسلم راج کے متعلق غلط فہمیاں غلط فہمیوں کا ایک سبب بیان کرنے کے بعد ہم دوسرے اسباب کی چھان بین کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں جو عداوت اور نفرت پھیلی ہوئی ہے وہ ان غلط فہمیوں پر مبنی ہے کہ ہندوستان میں مسلم حملے کی بنیاد تلوار کے زور سے اسلام کی اشاعت پر ہوئی تھی، جزیہ اس وجہ سے عاید کیا گیا تھا کہ لوگ معاشی غلامی میں جکڑے جائیں، مندروں کو ڈھاکر ہندی زندگی کی مذہبی بنیادوں کو جان بوجھ کر کھدوایا گیا۔ ان تمام کا سبب اسلام بحیثیت دین اور اسلام بحیثیت سیاسی قوت کے بتلایا جاتا ہے۔

غلط فہمیوں کے اسباب ہندوستان کی تاریخیں ہندوستانی مسلم حکومت کے متعلق عام مبہم خیالوں سے بھری پڑی ہیں جن کی وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ کیا ان عام بیانات میں رتی برابر بھی صداقت ہے؟ کیا یہ تاریخی مواد پر مبنی ہیں؟ یا کوئی من گھڑت

باتیں ہیں؟ یا کوئی تخیل کی پرواز یا کسی فتنہ طراز دماغ کی پیداوار ہیں؟ ہم اس بات کی جرارت کریں گے کہ اس مسئلے کی تحقیق کریں تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ ان عام خیال آرائیوں میں تاریخی صداقت کہاں تک ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہ ہندوستان میں پہلا مسلم حملہ اس غرض سے ہوا تھا کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ہو سکے، اس ضمن میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے ذریعے نہیں ہوئی۔ مسلم حملے کی نوعیت اس طرح کی تھی کہ اسلام کے آغاز سے قبل کابل اور اس کے قرب وجوار کے علاقے ہندوستان کی سرحد میں شامل تھے۔ ہندوستان کا تمدن کابل کے لوگوں کا تمدن تھا۔ غزنویوں کے ابتدائی عہد میں پورا کابل مسلمان نہ تھا۔ سیاسی نقطۂ نظر سے صوبہ کابل اکثر جھگڑے کا باعث بنا رہا۔ پنجاب کے ہندی راجاؤں کی ہمیشہ کوشش یہ رہی تھی کہ کابل پر قبضہ کرکے اپنے ملک سے اس کا الحاق ہو جائے۔ غزنوی عہد سے قبل اور ان کے زمانے میں بھی کابل کی لڑائی سیاسی بالادستی کی لڑائی تھی۔ شمال مغرب کی جانب سے مسلم حملے کی یہی پہلی وجہ تھی۔ غزنویوں کے ابتدائی حملے اور قبضے کی وجہ سیاسی اشتعال تھا۔ یہاں یہ بیان کر دینا بے سود نہ ہوگا کہ محمود کے پہلے حملے انتقامی تھے۔ ہندی غزنوی مسئلے کا سیاسی پہلو یہی ہے۔ ان کے علاوہ غزنوی حملوں کے اور بھی وجوہ تھے، لیکن اس زمانے کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ ان حملوں میں اشاعت اسلام کے درپردہ اغراض تھے۔ اگر غزنوی اشاعت اسلام کے لیے لڑتے تو دوران مہم میں جبری یا پرامن طور سے لوگوں کو حلقۂ اسلام میں داخل کرنے کی مثالیں بھی ملتیں۔

سلطان محمود کی شخصیت

خالص اسلامی نقطۂ نظر سے محمود کوئی مبلغ نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ مذہب کی اشاعت تلوار اور خونریزی سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے دل میں اگر اسلام کا درد ہوتا تو مفتوح اور ان کے ملکوں کی بربادی اس کے ہاتھوں ممکن نہیں تھی۔ محمود اگر ایک متعصب مسلمان ہوتا، تو اس کی فوجوں میں ہندو جاٹوں کی بھرتی ناممکن تھی لیکن خاص مسلم ملکوں کی تسخیر میں اس نے ان ہندو جاٹوں سے اکثر کام لیا۔ محمود کی شخصیت نرالی تھی اور ایسی شخصیت کا قانون بھی نرالا تھا۔ ہم یقین سے شہادت کی بنیاد پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا عمل کئی مرتبہ اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف رہا ہے باوجودیکہ وہ مسلمان تھا۔ اس کے حملے جو مسلم ملکوں پر ہوئے خلاف اسلام تھے یا شریعت کی رو سے غیر اسلامی تھے۔ اس نے وہاں وہی کیا جو ہندوستان میں کیا تھا۔ ہندوستان کے مندروں کو توڑنے اور ترکستان کے اسلامی ممالک کو لوٹنے میں اس کے دل نے بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ اس کے دل کی بھڑکتی ہوئی امنگیں مسلم اور غیر مسلم ملکوں کی صرف دولت اکٹھا کرنے میں ظاہر ہوئیں دولت کی ہوس نے اس کو ستایا تھا لیکن غزنی کو دولت اور خوبصورت بنانا اس کا مقصد تھا اس نے اسی مسلک کے تحت وہ کیا جو اس کی قوت میں تھا۔ جس طرح ملک گیری کے مقصد کے حاصل کرنے کے لیے واجب یا غیر واجب ذرایع اختیار کیے جاتے ہیں اسی طرح محمود کے پیشِ نظر جو مقصد تھا اس کے حصول کے لیے

اُس کا عمل صحیح تھا۔ غزنویوں کی نظر میں وہ ایک ہیرو تھا، لیکن دوسرے مسلم اور غیر مسلموں کے نزدیک ایک فتحمند آمر۔ اپنی طبیعت کے اعتبار سے محمود کا رویہ اور عمل اخلاق انسانی اور شریعت اسلامی کے بالکل خلاف تھا۔ اشاعت اسلام کا خیال تاکہ دنیا کے ممالک اس سے تہذیب پائیں یا بنی نوع انسان کی خدمت کی جائے ہرگز اس کے ذہن میں نہ تھا اور اگر چاہتا بھی تو وہ اسلامی سیاسی مسلک کا کبھی پابند نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ کسی قانون کا پابند نہ تھا خواہ تمدنی ہو یا اخلاقی ہو یا مذہبی۔ محمود اپنے زمانے کا ہیرو پرستش تھا اور ساتھ ہی اس میں اپنے زمانے کی کمزوریاں بھی موجود تھیں۔ اس کے زمانے کا خصوصی امتیاز تھا کہ معبدوں کو مسمار کیا جائے اور بنی نوع انسان کو یا تو قتل کیا جائے یا غلام بنایا جائے۔ ایسے خلاف انسانی فعل میں نہ کسی نسل کا امتیاز تھا نہ عقیدہ کا، اور نہ دین کا۔ اسی کو اُس زمانے میں فنِ جنگ سمجھا جاتا تھا۔ اس لحاظ سے محمود اپنے زمانے کا آدمی تھا۔ اس میں اس کا قصور نہ تھا کہ وہ جہاں جاتا وہاں خونریزی اور لوٹ مار کرتا۔ یہ تو اس زمانے کا تقاضا تھا جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ جب محمود کی شخصیت یا ذات زیر بحث آئے تو دینِ اسلام کو اس کی وجہ سے ملامت کا نشانہ بنانا مناسب نہیں۔ محمود جیسے آدمی سیاسی معاملات میں خود ہی قانون ہوتے ہیں۔

دوسرے مسلم حکمرانوں کا مسلک

ہندوستان میں جو دوسرے مسلم فاتحین آئے ان سب کا انداز اور

رنگ ڈھنگ یہی تھا۔ ان کا حقیقی مقصود یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح سیاسی برتری حاصل کریں نہ کہ اسلام کا پرچار دین کی حیثیت سے کریں۔ جب وہ ہندوستان میں سیاسی برتری حاصل کر چکے اور جب کسی دوسرے سے برسرِ جنگ ہوئے تو ہندو راجاؤں کی فوجیں ان کے ساتھ تھیں اور ان کی طرف سے لڑتی تھیں۔ یہ تاریخی واقعات ہمارے ملک کی تاریخ کے عام واقعات ہیں۔ اگر انھیں سیاسی قوت کے ذریعے سے اسلام کے پھیلائے جانے کا معمولی سا بھی شبہ ہوتا تو اس سے دو نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ اول تو یہ کہ ہندو راجاؤں نے مسلم حکمرانوں کو جو مدد دی تھی اس کے دینے سے انکار کرتے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے کہ ہندو راجا خود اپنی پرجا کی تمدنی اور مذہبی زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں سے تباہ اور برباد کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ جنگیں خالص مذہبی ہوتیں تو لوگوں کی جانب سے عام بغاوتیں مسلم حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتیں۔ اس زمانے کی خصوصیت اس طرح نظر آتی کہ لوگ اپنے مذہب کو بچانے کے لیے بغاوتیں کرتے لیکن ہماری تسکین اس امر میں پوشیدہ ہے کہ ایسی بغاوتوں کے علامات کہیں بھی نہیں ملتے۔ اہل ملک کو اپنے مذہب کی حمایت میں ان بدیسی مسلمانوں کے خلاف علمِ بغاوت کے بلند کرنے کی کوئی ضرورت پیش ہی نہیں آئی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خالص سیاسی اغراض کے تحت جنگیں ضرور ہوئیں لیکن مذہب ہرگز ان جنگوں کا باعث نہ تھا۔ جیسے جیسے مسلم سلطنت کے حدود بڑھتے گئے ویسے ہی ان کے سیاسی طرزِ عمل کی

اصل غایت ظاہر ہوتی گئی۔ اور یہ امر صاف ہوگیا کہ ہندو اور مسلم سپاہی دوش بدوش ہوکر مسلم رجواڑوں کے خلاف اور ہندو مسلمانوں کی مخلوط فوجیں ہندو رجواڑوں کے خلاف لڑیں۔ قرونِ وسطیٰ کی خصوصیت ہم کو پورا پورا یقین دلاتی ہے کہ یہ تمام کشمکش محض سیاسی تھی۔ مسلم حکمرانوں نے جو کچھ کیا اس سے محض سیاسی اغراض وابستہ تھے نہ کہ دینِ اسلام کا جوش و ولولہ۔

جزیہ اور مندروں کی مسماری کا مسلہ

جزیہ اور مندروں کے مسمار کرنے کے سلسلے میں جو غلط فہمیاں اہلِ ہند کے دلوں میں پیدا ہوگئی ہیں ان کے متعلق کچھ بیان کرنا ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جزیہ اس لیے عاید کیا گیا تھا کہ لوگ اقتصادی غلامی کا شکار بن سکیں اور مندروں کے توڑنے میں "اسلامی" مملکت کی یہ پالیسی تھی کہ لوگوں کی سماجی زندگی کی مذہبی بنیادیں کمزور کر دی جائیں۔ ان دونوں مسئلوں پر علمی تحقیق کی بے حد ضرورت ہے۔ جب تک کہ یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک موجودہ ہندوستان کے ہندو مسلم مسئلے کے نفسیاتی پہلو کا حل ممکن نہیں۔ اس لیے اس کا حل کرنا بے حد ضروری ہے اس کے حل ہونے سے نہ صرف غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی بلکہ اہلِ ملک کے دلوں کو ایسی تقویت پہنچے گی کہ پرانے زخموں کے بھرنے اور اچھا کرنے میں قوتِ قلب اپنا اثر دکھائے گی۔ قوتِ قلب تمدن کے میل جول اور معاشرتی یک جہتی کے پیدا کرنے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندو مسلم مسئلے کا حل نئے قوانین کے بنانے سے نہ ہوگا، نہ کانفرنس منعقد کرنے سے۔ اس کا حل اسی وقت ممکن ہے

جبکہ ہماری نفسیاتی الجھنیں تاریخی تعصبات کے متعلق دور ہو جائیں۔ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہندوستان کے زمانۂ وسطیٰ کے تمدن کی تعمیر میں انسانیت آموز قلبی جذبات کام کر رہے تھے۔ اب ہم ان دونوں مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ جزیہ کا مسئلہ بالکل عیاں ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے وہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں جو غیر مسلم ہوں۔ ذمی جزیہ دے کر اسلامی مملکت کی حفاظت میں بغیر اپنی شخصی آزادی کھوئے ہوئے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جزیہ ایک نہایت ہی خفیف سی رقم ہے جو اسلامی مملکت ذمیوں سے سالانہ طلب کرتی ہے۔ اصلیت تو یہ ہے کہ جزیہ کے عاید کرنے سے تمام غیر مسلم رعایا ہر طرح کی جبری فوجی خدمت سے سبکدوش ہو جاتی ہے حالانکہ ہر مسلمان از روئے پیدایش جبری فوجی خدمت سے کسی حالت میں معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ذمیوں کے حقوق تسلیم کر لینے سے اسلامی مملکت اپنے اوپر قانونی پابندی عاید کرتی ہے کہ وہ من مانے حکومت نہیں کر سکتی ایک طرف اسلامی حکومت از روئے قانون ذمیوں کی شخصی حفاظت کی ذمہ دار ہے اور دوسری طرف ذمیوں کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبدوں اور مقدس مقامات میں آزادی کے ساتھ عبادت کریں۔ اسلامی مملکت اپنی شریعت کی تابع اور پابند ہے۔ مقامات مقدسہ یا معبدوں کا گرانا کجا اس کو قانوناً یہ حق حاصل نہیں کہ وہ ذمیوں کی مذہبی زندگی میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ ذمیوں کی حفاظت اپنے ذمہ لینے کے بعد ان کو ستانا اور ان کے حقوق پر دست اندازی کرنا قطعاً ممنوع ہے۔ از روئے شریعت اسلامی جزیے کا یہ نظریہ اور عمل ہے۔

جزیہ کے شرایط اسلامی حکومت کے جزیے کے مسلے کی ایک خاص بات

سے عموماً چشم پوشی کی جاتی ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ تمام غیر مسلم رعایا پر بلا استثنا جزیہ لگانا از روئے شریعت جائز ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض مخصوص طبقے ایسے ہیں جن پر جزیہ نہیں لگایا جا سکتا۔ علما، طالب علم، بیروزگار، گداگر، اپاہج، عورتیں، اور بچے۔ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا واضح ہے کہ ذمی آبادی کے بہت بڑے حصے پر یہ "ٹیکس" جزیہ کی شکل میں عاید نہیں ہوتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت میں مسلم یا غیر مسلم رعایا کی زندگی ناگفتہ بہ نہیں تھی بلکہ رعایا کو کافی مراعات حاصل تھیں کہ وہ اپنی زندگی میں ہر طرح کی ترقی کر سکیں۔

ہندی مسلم راج، جزیہ اور مندروں کی مسماری

اب ہم دیکھیں گے کہ ہندوستان کے مسلم راج میں جزیے کا عاید کرنا اور مندروں کا برباد کرنا شریعت اسلامی کی رو سے ہونے کی نام نہاد روایت کہاں تک صحیح ہے۔ ہندوستان میں کبھی خاص طور پر مسلم حکمرانوں نے یہ کوشش نہیں کی کہ شریعت کی بموجب غیر مسلم آبادی کے مرتبے اور حیثیت کی وضاحت کرتے۔ اس قاعدۂ کلیہ سے صرف وہ عرب مستثنیٰ ہیں جنھوں نے آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ میں حکومت قائم کی تھی یہاں عربوں کی حکومت کے تفصیلی واقعات کے بیان کرنے کی گنجایش نہیں ہے، لیکن صرف اتنا کہہ دینا مناسب ہوگا کہ عربوں کو از روئے شریعت اسلامی غیر مسلموں کے حقوق اور حیثیت قرار دینے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ ہندوستان میں عربوں کے زمانے کی تاریخ اس بات کی

شاہد ہے کہ ذمیوں کی حالت بہت اچھی تھی۔ مذہبی رواداری عام طور پر رائج تھی۔ لوگ عربوں سے اس قدر مانوس تھے کہ انھوں نے عربوں کی حکومت کو مستحکم بنانے میں انتہائی کوشش کی اور ہمیشہ ان کے بہی خواہ اور ان کے عدل و انصاف کے گیت گاتے رہے۔ اصل اسلام نے بحیثیت ایک سیاسی قوت کے ہندوستان میں اس طرح اپنا اثر ڈالا۔

ہندی سلاطین کا غیر اسلامی رویہ

ہندی سلاطین کا رویہ جنھوں نے غیر مسلموں کے حقوق کو متعین نہیں کیا اسلامی نقطۂ نظر سے جانچا نہیں جاسکتا گو ان کا مذہب اسلام ہی تھا؛ اگر وہ شریعت کے اصول پر اس زمانے کے مسلمانوں کی طرح حکومت کرنا چاہتے تو ان پر اسلامی احکام کی پابندی لازمی تھی۔ مگر تعجب تو یہ ہے کہ انھوں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی کہ اپنی حکومت اور سلطنت کو اسلامی اصول پر چلائیں۔ ہم نہیں بتلا سکتے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صرف اتنا کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کو سیاسی ضرورت کہیے یا دوراندیشی یا یہ کہیے کہ ان کو اپنے اوپر اعتماد نہ تھا۔ یا انھوں نے اسکو مناسب نہیں سمجھا کہ سیاست کو مذہب میں رنگیں۔ جو کچھ بھی سبب ہو انھوں نے غیر مسلموں کے حقوق و حیثیت کا امتیاز نہیں کیا اور نہ اس کی تعریف و تحدید کی۔ اس لیے ان سلاطین کے کارناموں کو جانچنے کا معیار اگر کوئی ہے بھی تو وہ اسلامی نہیں ہوسکتا۔ بالفاظ دیگر تاریخ ان کو بحیثیت انسان کے جانچے گی۔

ہندی سلاطین کی ذہنیت

اسلام بحیثیت سیاسی قوت کے اور اسلام

بحیثیت دینی قوت کے ان قوانین سے بالکل بری الذمہ ہے جنھیں ان بڑے بڑے سلاطین نے اپنے زمانے کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر وضع کیا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اپنے سیاسی تسلط کے قائم رکھنے کے لیے اپنے زمانے کے موافق جو بہتر سمجھا کیا۔ ان کے زمانے کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جزیہ اگر لیتے تھے تو مندر بھی گراتے تھے۔ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ہندی سلاطین کی ذہنیت سے ظاہر ہے کہ ان پر بعض اوقات 'دنیادار' علما حاوی ہو کر اپنا اثر ڈالتے تھے جو ان کے دربار میں ہمیشہ موجود رہتے اور دینی اور دنیاوی مسائل سے متعلق مشورے دیا کرتے تھے وہ اکثر و بیشتر زمانے کی اصلی اسپرٹ سے بالکل بے خبر اور اپنے 'عقاید' کے اتنے سخت پابند ہوتے تھے کہ سیاسی معاملہ فہمی کی اصلیت معلوم نہ کرتے اور نہ اس کے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کے 'اسلامی' نظریوں کا تصادم سیاسی حالات سے ہونے کا امکان تھا۔ بعض اوقات ہندی سلاطین نہایت ہی جوش و خروش سے اپنی شان اور شوکت کو دکھلانے کے لیے اپنے آپ کو اسلام کے خادم کہلواتے تھے، حالانکہ اسلام کے اصولوں کا تعلق ان کی حکومت سے بالکل یونہی سا تھا۔ اسی وجہ سے مبلغین اسلام کی حیثیت سے وہ کوئی درجہ نہیں رکھتے۔ ممکن ہے کہ ان کے اس اندھا دھند جوش ہی کا نتیجہ ہو کہ غیر مسلم کے حقوق اور حیثیت کی تعریف کیے بغیر انھوں نے جزیہ عاید کرنے کی کوشش کی ہو۔ جزیے کی وصولی

اور مندروں کے توڑنے کی اگر کوئی توجیہ کی جا سکتی ہے تو صرف اسی طرح کہ اسلام نے ذمیوں کے مرتبے کا تعین کیا تھا ان کے حقوق مقرر کیے تھے۔ اگر کسی بادشاہ نے ان کو توڑا اور احکام اسلام کی نافرمانی کی تو اسلام کس طرح اس کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی ذمہ دار تھے بھی تو خود ہندی سلاطین تھے۔

مندروں کی مسماری کا مسئلہ

مندروں کے توڑنے کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ہندی مقدس مقامات کا برباد کرنا مسلمانوں کے ہندوستان آنے کے بعد شروع ہوا۔ تاریخ تو ہمیں یہ بتلاتی ہے کہ مسلم راج سے قبل ہندوستان کے مختلف عہدوں میں ہندو راجواڑوں کے حکمرانوں نے مندروں کو لوٹا ہی نہیں بلکہ مسمار بھی کیا۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کی سماجی تمدنی تاریخ ان واقعات سے بھری پڑی ہے۔ بدھوں اور جینیوں کے زوال کا باعث ان کا مذہب نہ تھا بلکہ منظم براہمنیت کی قوت تھی جس کا اثر ہندوستان کے تقریباً تمام راجواڑوں پر رونما تھا۔ یہ واقعات ہماری تاریخ کے مسلم راج کے قیام سے بہت قبل ہی کے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ مسلمانوں کے سر یہ الزام لگایا جائے کہ انھوں نے ان مندروں اور خانقاہوں کو برباد کیا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ زمانۂ وسطیٰ میں دشمنوں کے مقدس مقامات کی تباہی لڑائی کے لڑنے کا ایک زبردست حربہ سمجھا جاتا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مندر کیوں برباد کیے گئے؟ اس کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے کہ مندر مقدس مقامات تصور کیے جاتے تھے

ان میں جو مورتیاں ہوتی ہیں ان کے متعلق یہ اعتقاد تھا کہ ان کو فوق فطری طاقتیں حاصل ہیں اور وہ اپنے پوجنے والوں کی محافظ بھی ہیں۔ دوسرے یہ کہ مندر اس زمانے کے سیاسی اور تمدنی مرکز تھے اور ان میں بیش بہا دولت بھی جمع ہوتی تھی۔ اس زمانے کی جنگوں میں حملہ آور فوجوں کا مقدم خیال یہ ہوتا تھا کہ دشمنوں کی کمزوریوں سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ قرونِ وسطیٰ میں مندروں کے گرا دیے جانے سے فتح یابی کا اور بھی زیادہ یقین ہو جاتا تھا، کیونکہ دیوتاؤں کی بے حرمتی ان کے پوجنے والوں کی طاقت کو فنا کر دینے کے مماثل تھی۔

دیوتا اپنے پرستاروں کے پشت پناہ تھے۔ جب دیوتا مسمار ہوئے تب لوگوں کی کمر ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ ایسی حالت میں ان کی استقامت کہاں باقی رہ سکتی تھی اور ان کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ مندروں کی جمع شدہ دولت فاتح افواج کی بقا کا ذریعہ تھی اور اسی وجہ سے لڑائیاں بھی خونریز اور شدید ہوتی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کی جنگوں میں ملک کو فتح کرنے کا مقصد سب سے مقدم رہتا تھا اور اس مقصد کے حصول کے لیے ایسے طریقے اختیار کیے گئے جس سے ملک جلد ہاتھ آگئے۔ اس میں کلام نہیں کہ دورانِ جنگ میں مقدس مقامات ڈھائے گئے۔ مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ فنِ جنگ کا آپ اپنا ہی قانون ہوتا ہے۔ دورانِ جنگ میں دینی اور اخلاقی اصولوں کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔ جنگ صرف فتح یا شکست پر غور کرتی ہے۔

اگر مسلم حکمرانوں نے جنگ کے بعد مندر گرائے تو بلاشبہ اسلامی احکام کی خلاف ورزی کی لیکن تاریخ شاہد ہے کہ حکمرانوں نے مندروں کو بے شمار عطیات بھی دیے تھے اور بعض مرتبہ شاہی خزانے سے ان کی از سر نو تعمیر بھی کروائی تھی۔ ہندوستان کی مسلم حکومت کے متعلق جو کچھ اب تک پیش کیا گیا ہے وہ ایسے اہم امور ہیں جن کے متعلق سخت غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہیں۔ ہندوستان کے باشندوں کے دلوں میں مسلم حکمرانوں سے متعلق جو نفرت اور کراہت پیدا ہوئی اس کی وجہ بھی یہی امور ہیں۔ زمانۂ وسطیٰ کے معاملات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اسی زمانے کے معیار کی ضرورت ہے۔ زمانۂ وسطیٰ کے ہندوستان کو صحیح طور پر سمجھنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہندوستانی قومیت کے پیچیدہ ترین مسائل پر بڑی حد تک روشنی پڑ سکتی ہے کیونکہ زمانۂ وسطیٰ کے مسلم حکمرانوں کی رہبری سیاست کر رہی تھی نہ کہ مذہب۔

عہد وسطیٰ میں تمدن اور سیاست کا تعلق

اب یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس زمانے کے تمدنی اور مذہبی کارناموں کا کچھ اندازہ لگائیں کیونکہ ہمارا خیال ہے کہ اس زمانے کی حکومت کی بنیاد تمدنی قوتوں پر بھی رکھی گئی تھی۔ زمانۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں سیاسی اور تمدنی زندگی میں ہم آہنگی اتحاد اور یک جہتی بھی نظر آتی تھی۔ ہندوستان کے لوگوں کی زندگی میں اس باہمی تعلق کی بنا پر تعمیری اور اتحادی سماجی قدروں کا نشوونما

ہوا تھا۔ اس زمانے کے ہندوستان کا یہ پہلو دراصل ایک حقیقی بنیاد کا کام دیتا رہا، جو جدید ہندوستان کی قومی عمارت کے کھڑا کرنے میں بھی کام دے سکتی ہے۔ مسلم حکومت نہ صرف سیاسی تھی بلکہ اس کا سیاسی ڈھانچا تمدن کی مضبوط اور استوار بنیادوں پر تھا۔ اس تاریخی امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جب مسلم حکمران عملی اور جذباتی طور پر ہندوستانی ہو گئے تو انھوں نے اپنی حکومت کا نیا نصب العین قرار دیا اور واقعی یہ طریقۂ عمل ہندوستان کی ضروریات کے بموجب نہایت ہی مناسب تھا۔ اس سے ہندوستان کی تمدنی نشو و نما میں مدد ملی۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا یہ نامور مسلم حکمران دو اہم نتیجوں پر پہنچے؛ اول یہ کہ حکومت کے استحکام کے لیے یہ لازمی ہے کہ امور حکمرانی اور سیاست میں علما اور ان کے دبستان کی مداخلت بالکل خلاف تدبر ہے؛ دوسرے یہ کہ بغیر اہل ہند کو شریک کار کیے حکومت کا اطمینان بخش طور پر چلنا تو درکنار اس کی پایداری پر بھی بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا تدارک ان بڑے بڑے بادشاہوں کے پاس سوائے اس کے اور کیا تھا کہ وہ اپنی ہندی رعایا کی دلچسپی کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کریں بلکہ اس کی بھی کوشش کریں کہ وہ امور حکمرانی میں حصہ لے کر اس کو پایدار بنائیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کی بہبودی ہندؤں اور مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان دونوں میں سے اگر کسی ایک کا وجود نہ ہو تو حکومت درہم برہم ہو جائے گی۔ مسلم حکمران بہت جلد اس سیاسی اصول کے قایل ہو گئے۔

ہندی مسلم حکمرانوں کے سیاسی، تمدنی کارنامے

ان سیاسی نظریوں اور اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں سلطان علاءالدین نے مذہب کو سیاسیات سے علیحدہ کر کے علما کی قوت اور ان کے اثرات کو زائل کیا۔ سلطان محمد تغلق بھی اپنے پیشرو کے قدم بہ قدم چلا اور اس کی بھی یہی کوشش رہی کہ سیاسیات میں علما کے اثر کو معدوم کرائے۔ اپنے عہد حکومت میں اس نے ہندیوں کو اعزاز دے کر بلند مرتبہ کیا۔ اکبر اعظم کی شخصیت نے اس تحریک کو انتہا پر پہنچایا۔ اکبر کی منتہیٰ وہ تھی جس کی وجہ سے ملکی سیاسیات پر تمدنی جلا ہوئی وہ اپنے دور کا روح رواں تھا۔ وہ ایک نئے امتزاجی تمدن کی تشکیل کے درپے تھا تا کہ وہ سیاست کی بنیاد کا کام دے سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہم اکبر کو اپنا پہلا قومی شہنشاہ تصور کرتے ہیں۔ ہندی اور مسلم تمدنوں کی میں ہم آہنگی پیدا کرنا اکبر کا واحد مقصد تھا۔ سیاست کے جسد میں ایسے امتزاجی تمدن کی روح کا پھونکنا صرف اسی کا کام تھا۔ اکبر یہ سمجھ چکا تھا کہ ہندوستان کی اصلی سیاسی معاشری اور مذہبی ترقی صرف اسی میں ہے کہ ہندوستان کے مختلف تمدنوں کے اختلاط سے ایک تمدن پیدا ہو جو حقیقتاً ہندوستانی تمدن کہلایا جا سکے زمانۂ وسطیٰ کا ہندوستان اسی تمدن پر پروان چڑھا اور زندہ رہا۔

جدید ہندوستان میں اختلاطی تمدن کی ضرورت

آج بھی ہندوستان کو اپنی قومی زندگی

کی تشکیل میں اپنی تمدنی اصولوں کو لے کر چلنا چاہیے' اور اس
کی یہ کوشش کہ اپنے مستقبل کی تعمیر میں خالص سیاسی فرقہ وارانہ اصول
کارگر ہوں بے سود معلوم ہوتی ہے۔ اس بات کو نہ بھولنا چاہیے
کہ ہندوستان کی قومیت کی عمارت صرف سیاسی بنیاد پر قائم
نہیں کی جاسکتی بلکہ اختلاطی تمدن ہی اس کی بنیاد ہو سکتا ہے۔
اصلیت تو یہ ہے کہ ہندوستانی قومیت کی تشکیل میں تمدن
کی اتحادی قوتیں لازم ہیں۔ اس طرح جدید ہندوستان ایک
قومی ڈھانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ اگر ہندوستانی قومیت کی
بنیاد اختلاطی تمدن پر نہ رکھی جائے گی تو ہندوستان کی قومی زندگی
خطرے میں پڑ جائے گی۔ ہندوستانی قومیت کی تشکیل میں سیاست
اور تمدن کا امتزاج ناگزیر ہے۔ ان دونوں میں کسی ایک کی عدم
موجودگی ہندوستانی قومیت میں ایسی کیفیت پیدا کرے گی جیسے
کسی عمارت کو بغیر بنیاد کے تعمیر کیا جائے۔ یہی حالت موجودہ ہندوستان
کی ہے۔ آج کل جو بے چینی پھیلی ہوئی ہے وہ اس بات کی علامت
ہے کہ اس میں سیاست کا فاسد مادہ بہت زیادہ پیدا ہو چکا ہے
اور اختلاطی تمدنی قوتوں کا فقدان ہے۔ ہندوستان اپنی اس بیماری کو
سیاسی منتروں کے ذریعے سے شفا حاصل کرنے کی بے سود کوشش
کر رہا ہے۔ وہ جتنا بھی اپنا علاج ان منتروں سے کرے گا اتنے ہی
ایک باصحت قومی زندگی کے امکانات دور ہو جائیں گے۔ اس کو

دراصل ایک تمدنی علاج کی ضرورت ہے۔ اسی میں اس کی نجات ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کو کس قسم کے تمدنی علاج کی ضرورت درپیش ہے؟ اور اپنی سیاسی بیماری کے ابتدا سے اس نے علاج میں غفلت کیوں برتی؟ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے مرض کی تشخیص صحیح طور پر نہیں ہوئی تھی۔ ان سوالوں کے جواب سے ہندوستانی قومیت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہم ابھی کہہ آئے ہیں کہ مختلف مسائل کے حل میں ہمیں زمانۂ ماضی سے مدد لینی چاہیے۔ وہی موجودہ ہندوستانی قومیت کے پیچیدہ مسائل میں ہماری رہنمائی کر سکتا ہے۔ اس مسئلے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے ہم اصل موضوع سے ذرا ہٹ کر بحث کریں۔

اسلام کا اثر جنوبی ہندوستان پر

زمانۂ وسطیٰ کی کہانی، جہاں پر چھوڑی گئی تھی وہاں سے شروع کی جاتی ہے۔ ہندیوں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول کا جو اثر زمانۂ وسطیٰ کی زندگی پر پڑا تھا اس کو واضح کرنا بہت ہی مناسب ہے۔ انہی تمدنی تعلقات کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانی سماج میں تمدنی اتحاد اور اتفاق پیدا ہوا۔ مذہب اسلام کا اثر ہندوستان پر اسلامی سیاسی قوت سے بہت قبل رونما ہوا تھا۔ سب سے پہلے اسلام کے تعلقات جنوبی ہندوستان سے قائم ہوئے۔ مختلف اسلامی ممالک کے مسلمان سوداگروں نے ہندوستا

سے تجارتی تعلقات قائم کیے اور ان کے ساتھ ہی مسلمان بزرگوں
کی آمدورفت لنکا میں شروع ہوئی جو ایک زیارت کا مقدس
مقام تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح اسلام کے تعلق کی بنا جنوبی
ہندوستان سے پڑی۔ ان تعلقات کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں
نے اس ملک میں رفتہ رفتہ پُر امن طور سے نوآبادیات قائم
کیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ اہلِ ملک میں ذہنی بیداری کے اسباب بھی
پیدا کیے۔ مسلمان سوداگروں کی دیانت اور راست بازی اور مسلمان
پیرو بزرگوں کے انسانی برتاو اور تحمل اور ان کے خدمت خلق
کی اسپرٹ بلا لحاظ مذہب و ملت لوگوں کی زندگی پر دور رس
اثرات ڈالے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنوب میں اسلام کا خیر مقدم
کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جنوبی ہندوستان کے ہندی راجاوں
کی حمایت میں اور سرپرستی کے تحت اسلام کو مقبولیت حاصل
ہوئی۔ ایک طرف مسلمان سوداگروں اور پیروں کی وجہ سے اور
دوسری طرف ہندی راجاوں کی شاہی سرپرستی اور امداد
کے سبب سے ہندی سماج میں اسلام کو ایک خاص حیثیت حاصل
ہوئی۔ اسلام کی ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس
زمانے کے ذی فہم ہندیوں نے اسلام کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش
کی تھی اور اس طرح اسلام ہندی دل میں جگہ کر سکا اور اس
کو یہاں تک کامیابی حاصل ہوئی کہ وہ بغیر سماجی وحدت کے

اصولوں کو برباد کیے معاشرتی زندگی پر اپنے اثرات ڈالے اور
پیوست بھی ہونے لگا۔ اسلام کا عقیدہ اور عملی زندگی میں برادری
کا اسلامی اصول دو قومی عناصر تھے جن کے ذریعے ہندیوں کی
ذہنیت میں پرامن طور پر تبدیلی واقع ہوئی اور اس کے ساتھ
ہی ذہنی قوتوں کی تشکیل میں مدد دی تاکہ سماج کی پرانی قدریں
بغیر سماج کی زندگی کو برباد کیے نئی بن سکیں۔ اس طرح سے ہی
اسلام بغیر خون کا ایک قطرہ بہائے جنوبی ہندوستان میں اپنے
قدم جما سکا۔ جنوبی ہندوستان میں اسلام کی مقبولیت اور
کامیابی کی داستان یہاں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیجا سکتی
ہے۔ ہندوستان میں جو دیرپا یا مستقل کامیابی اسلام نے
حاصل کی اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستانی
عورتوں سے رشتۂ ازدواج جوڑ کر سماجی زندگی میں اپنا اثر
قائم کیا۔ ہندیوں اور مسلمانوں کے خون کی اس آمیزش نے
باہمی خیر خواہی، دوستی اور رواداری کی بنیادوں کو اور بھی
مضبوط کر دیا اور لوگوں کے دلوں سے جذبۂ اجنبیت کو دور
کرنے میں مدد دی۔ اس سے یہ بھی ہوا کہ سماج کے پرانے قوانین
اور رسم و رواج برقرار رہے گو ان میں اسلامی اثر سے ترمیمیں
ہوئیں۔ اس طرح سماج کے اتحادی قوانین ویسے ہی قائم رہے۔
جیسے کہ قدیم زمانے میں قائم تھے۔

اسلام کا اثر شمالی ہندوستان پر

اسلام کا نفوذ شمالی ہندوستان میں کیسے ہوا

اور اس کا اثر ہندوستانی سماج پر کیا پڑا ہے؟۔ پہلے اس سوال کا
جواب دینا ضروری ہے کہ آیا شمالی ہندوستان میں اسلام نے
زندگی کی قوتوں کو اس طرح فروغ دیا جس طرح کہ اس نے جنوبی
ہندوستان میں دیا یا وہ شمالی ہندوستان میں سیاسی تمدنی انتشار
کا باعث تھا؟۔ شمالی ہندوستان میں مسلم سیاسی قوت کے ساتھ
ہی اسلام داخل ہوا۔ بارھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد
سے پیر اور صوفی یہاں آنے شروع ہوے۔ انھوں نے یہاں بھی
اسی طرح کا کام کیا جیسا کہ جنوبی ہندوستان کے مسلمان بزرگوں
نے اگرچہ ان بزرگ ہستیوں کو کسی سرپرستی اور دست گیری کی
ضرورت نہیں تھی تاہم زمانہ وسطیٰ کے اکثر حکمرانوں نے ان کی سرپرستی
اور حمایت بھی کی۔ ان بزرگوں کی زندگی کا نصب العین اعلیٰ
تھا یعنی یہ کہ وہ مخلوق کی خدمت خالق کی عبادت کا ذریعہ تصور
کرتے تھے ہماری تاریخ شاہد ہے کہ ان اولیاے کرام کی تمام
زندگی اسی مسلک پر عمل پیرا ہونے میں صرف ہوئی۔

صوفیائے کرام کا فلسفۂ حیات

ان بزرگوں کی نگاہ میں تمام انسان خدا کے ہاں برابر ہیں لوگوں
کی خدمت بلا لحاظ ذات، عقیدہ اور دین کرنی چاہیے ان کے نزدیک سب

سے بڑا کارِ ثواب اور نیکی یہی تھی انسانیت کی تحریک کے سب سے بڑے علمبردار یہی حضرات تھے۔ انھوں نے زمانۂ وسطیٰ کے لوگوں میں قوتِ قلب کی تاثیر کا یقین دلایا کیونکہ خدا کی عبادت اس کے بغیر ناممکن تھی۔ انسان کے دل کی فطری قوت میں ان کو کامل بھروسا تھا کیونکہ روحانی زندگی کی نشو ونما میں اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ وہ درحقیقت اہلِ دل اور خداترس تھے ان کے خیال میں انسان کی روحانی تہذیب محض مذہبی احکام کی پابندی نہیں بلکہ انسانیت آموز جذبات کے تحت ہوتی ہے۔ انسان کا دل خدمتِ خلق اور عبادتِ الٰہی کے جذبات اور احساسات سے جب تک پُر نہیں ہوتا اس وقت تک انسان اپنے مسلک سے دور ہے۔ لہٰذا زمانۂ وسطیٰ کی پُر اثر دلکش اور انسانی ہستیوں نے ہندوستان کو بہت سے اچھے تہذیبی سبق دیے تھے۔ پہلا سبق یہ تھا کہ ہر انسان بحیثیت ایک مذہبی ہستی کے پیدائشی حق رکھتا ہے کہ وہ خدا کو دیکھے، محسوس کرے اور اس کے جلوے سے محظوظ ہو۔ دوسرا یہ کہ پیدائش اور پیشے کی بنا پر انسان اور انسان میں کوئی فرق یا امتیاز نہیں ہے، کیونکہ خدا کی نگاہ میں تمام انسان برابر ہیں۔

اختلاطی تمدن کے علمبردار

ان تمام جری ہستیوں نے اپنی پُرامن تعلیم سے ہندوستان کو بھرپور کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں مذہبی رہبر رفتہ رفتہ

پیدا ہوتے گئے۔ جنھوں نے صوفیوں کے اصول کو عملی جامہ پہنایا۔ رامانند، ویبا، بسوا، کبیر، چیتنیا، نانک، داود وغیرہ سماجی زندگی کے روحانی گرو تسلیم کیے گئے۔ ان مصلحین نے زمانے کی شدید ضروریات کو اس طرح سمجھا تھا کہ انسان اور سماج کی زندگی میں انسانیت کے اصول کے تحت روحانی عناصر کو فروغ دیا جاسے۔ ہمارے ملک کی سماجی تاریخ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ ان سب کی تعلیم کے اصول اسلامی عقاید پر مبنی تھے۔ آجکل کے مورخین اس واقعے کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ زمانۂ وسطیٰ کے ہندوستان میں دو اہم اصولوں کی بنا پر اسلام کا پُرامن نفوذ ہوا۔ یعنی خدا کی وحدانیت اور انسانی برادری کا تخیل۔ جہانتک کہ خدا کی وحدانیت کا تعلق ہے ہندوستان کے بڑے بڑے مفکرین اور فلسفی اپنے مذہب کے بنیادی اصول میں خدا کی وحدانیت کو تسلیم کرتے چلے آئے لیکن عام ہندی ذہنیت پر خدا کی وحدانیت کی بجائے ان کے محافظ دیوتا غالب آئے اور ان کا اثر ان کی روزمرہ کی زندگی پر پڑا۔ یہ اسلام ہی کا براہ راست اثر تھا کہ خدا کی وحدانیت کا تخیل نہ صرف نظری طور پر بلکہ ان کی زندگی میں عملی طور پر بھی دکھائی دیا

ہندوستان کے بڑے بڑے مصلحین نے ذات کی تفریق اور پابندیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، کیونکہ لوگوں کی روحانی اور سماجی زندگی کے راستے میں وہ رکاوٹ پیدا کرتی تھیں

لیکن حقیقت میں یہ سماجی ناانصافی کے خلاف بغاوت اسلام کی وجہ سے پیدا ہوئی، کیونکہ خدا کے سامنے انسانی مساوات خالص اسلامی تخیل ہے۔ یہ ایک مقام مسرت ہے کہ اہل ہند نے ان اسلامی اصولوں کو بڑی خوبی اور صلاحیت کے ساتھ اپنے سماجی فلسفے میں سمویا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان بڑے ہندی مبلغین نے اسلام کے سماجی اور مذہبی فلسفے کو ہندی خیال پرستی کے ذریعے سے لوگوں تک پہنچایا۔ یوں تو یہ تحریکیں بلاواسطہ گویا اسلام کی ترجمان تھیں اور اس طرح ہندوستان کے لوگ اسلامی مطمح نظر کے قریب تر ہوگئے۔

اختلاطی تمدن کا قومی پہلو

اسلام اور ہندی مذہب کے اس اختلاط نے نہ صرف ایک امتزاجی کیفیت سماج میں پیدا کی بلکہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں بڑی مدد دی۔ صرف ایسا ہی نہیں ہوا بلکہ ہندوستان کے بڑے بڑے متفکرین نے یہ کوششیں کیں کہ ایسا صحیح راستہ دریافت کیا جائے جو ہندوستانی قومیت کی داغ بیل ڈالنے میں مدد دے۔ یہ کوششیں اس لیے ناکام رہی کہ اس زمانے کے لوگوں کی ذہنیت ایسی نہیں تھی کہ ان بڑے متفکرین کے بلند پایہ فلسفۂ حیات کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔ وہ زمانہ مذہبی رسم پرستی کا تھا اور نئے رجحانات کی مقبولیت ایک دشوار امر تھا لیکن ہندوستان نے روحانی اور انسانی بنیادوں پر قومیت کے تخیل

کو نشو و نما دینے کا راستہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ آخر اس زمانے نے یہ بھی جتلایا کہ اپنے آپ کو پہچان کر روحانی نجات حاصل کرنا خود انسان ہی کے بس کی بات ہے۔ نیز یہ کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو نجات نہیں دلا سکتی جب تک انسان کے دل میں نجات کی خواہش خود پیدا نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان نے مذہبی مسائل کو حل کرتے ہوئے انسانی قلب کو روحانیت کا سرچشمہ قرار دیا۔ اور اس طرح مذہب کا مسئلہ ایک خالص شخصی مسئلہ بن کر اہمیت حاصل کر سکا۔ کسی شخص کی حیثیت یا اس کی پیدائش یا اس کا پیشہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مذہب ایک ذاتی سوال ہے نہ کہ سماجی۔ سماج کسی کو کوئی خاص مذہب اختیار کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی ہے۔ اس زمانے میں مذہب کے معنی یہ سمجھے جاتے تھے کہ وہ ایک باطنی اسراری تجربہ کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کی تاثیر یا اس کے اثر کو کوئی شخص بغیر ذاتی آزمائش کے معلوم نہیں کر سکتا۔ اس زمانے کے ہندوستان نے زندگی کی تشکیل کے لیے ایک نئی راہ دکھائی تھی تاکہ زندگی متمدن اور وسیع تر ہو اور لوگوں کی زندگی میں زیادہ آزاد خیالی پیدا ہو سکے۔ مذہبی زندگی میں زیادہ سے زیادہ رواداری پیدا ہو اور مذہبی تعصب بالکل جاتا رہے۔

آجکل ہندوستان اپنے مسائل کے حل کی تلاش میں سرگرداں ہے

حالانکہ زمانۂ وسطیٰ نے انھیں مسائل کو باہمی مصالحت کے ساتھ بآسانی حل کیا تھا۔ کوئی چیز اس وجہ سے ناقابل قبول نہیں سمجھی جاتی تھی کہ اس کی بنا اسلامی تھی یا ہندوستانی جیسے کہ موجودہ ہندوستان کے رویے سے ظاہر ہے۔ برخلاف اس کے انھوں نے رواداری سے زیادہ کام لیا اور ضروریات زندگی کے تحت تمام ہندی مسلم تمدنی قوتوں کو ایک جا جمع کر دیا۔ اس طرح زمانۂ وسطیٰ کی ہندوستانی قومیت کی عمارت ایک تمدنی بنیاد پر کھڑی کی گئی۔

۴
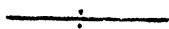
ہندوستانی قومیت کی دشواریاں

گروہی قومیت کا مسئلہ

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس زمانے میں تمدن کی اتحادی قوتیں موجود تھیں تو قومیت کے تخیل کی نشو و نما کیوں نہ ہو سکی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ زمانۂ وسطیٰ میں ہندوستانی قومیت کی نشو و نما میں دقتیں پیش آئیں گو اس زمانے میں اتحادی تمدنی قوتوں کی کمی نہ تھی۔ اس کے راستے میں جو رکاٹیں حائل ہوئیں وہ اصل منظم سماجی گروہوں کی موجودگی تھی جن کے عقیدے اور رسم و رواج مختلف تھے نہ لوگوں کی زندگی انہیں گروہی سانچوں میں ڈھالی جا رہی تھی اور ان کو اپنے انفرادی گروہی حلقے میں اپنی آزادانہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت تھی حالانکہ عالمگیر مذہبی بیداری نے ہندوستان کی سماجی قدروں میں نئے معنی پہنا دیے تھے۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ

یہ مذہبی رجحانات نظری اعتبار سے اپنے میں حیاتیاتی قوت
رکھتے تھے لیکن لوگوں کی گروہی زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا نہ کرسکے
کیونکہ یہ مذہبی قوتیں یا تو علحدہ علحدہ مذہبی گروہ میں منتشر ہوگئیں یا
لوگوں کی گروہی زندگی میں ان کے سماجی اور مذہبی اصول ضم
ہوگئے۔ اس طرح تنظیمی سماجی گروہ حیاتیاتی سماج کے راستے میں حائل
ہوتے ہوئے نظر آئے۔ گروہوں کی منظم زندگی نہ صرف تمدنی قوتوں
کے نشو ونما میں رکاوٹ تھی بلکہ اس کی وجہ سے تمدنی ارتقا میں
بھی کمزوری واقع ہوگئی۔ اسلام جس میں قوت حیات موجود تھی اس
کا بھی ہندوستان میں آکر یہی حشر ہوا۔ اس طرح سماجی زندگی اپنے
توازن کو قائم رکھ سکی اور بڑی خوبی کے ساتھ اپنے کو تباہ کن اثرات
سے بچا لیا لیکن قومیت کے راستے میں حائل ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ
ہندوستانی قومیت کا جذبہ ابتدائی مدارج ہی میں گھٹ کر مر گیا۔
زمانہ وسطی کا ہندوستان اپنے روپ اور اسپرٹ میں وسطائی ہونے کے
باوجود قومیت کے نشو ونما میں کامیاب ثابت نہیں ہوا گو اس میں
قومیت کے جراثیم موجود تھے۔ اس طرح قومیت کا مسئلہ حل ہوئے بغیر رہ گیا۔

جدید ہندوستان کا قومی مسئلہ

تمدنی اختلاط کی کوشش اسطرح قومیت کی عمارت کی تعمیر میں
رائگاں گیئں لیکن موجودہ ہندوستان کو وہی مسئلہ از سر نو حل کرنا پڑ رہا
ہے جب کہ اس کی زندگی کی تمدنی بنیاد کھسک چکی ہے۔ اس کا کام

اس وجہ سے بے حد دشوار ہو گیا کہ اس کو وہی پرانی تمدنی بنیاد ڈالنی ہے جو ہندوستان کے قومی بنانے میں اشد ضروری ہے۔ بجائے اس کے کہ گروہی منظم زندگی کے ڈھانچے کو توڑا جائے اس نے مختلف سماجوں کے تمدنی دباؤ کے تحت اس کو اور زیادہ مضبوط کر دیا ہے۔ پرانے اور نئے ہندوستان میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ پرانے ہندوستان میں زندگی کا دارومدار گروہی تخیلات اور احساسات پر تھا فرقہ وارانہ سماج کے عالمگیر انسانی اصول کے دباؤ اور تمدنی قوت کی وجہ سے پیدا نہ ہو سکی تھی۔ نئے ہندوستان کے پاس نہ تمدنی اثاثہ ہے اور نہ سماج کا ہمہ گیر انسانی اصول اور اس پر طرہ یہ کہ اس نے گروہوں کی مختلف زندگیوں پر جداگانہ سیاسی رنگ چڑھا کر سیاسی سماجی مسائل میں پیچیدگی پیدا کر دی ہے۔ اس نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ اگر تمدنی اتحاد و اتفاق جو زمانۂ قدیم اور وسطیٰ کے ہندوستان کی خاص خصوصیت تھی، اور جو ابتدا میں سماجی زندگی کے باہمی تعلقات اور فرائض کا نتیجہ تھا اور اور جو ہر گروہ کے زندہ رہنے اور زندہ رہنے دو کے حق کو مانتا تھا، ایک دفعہ بھی جاتا رہا تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے واپس نہیں لا سکتی۔ جب موجودہ ہندوستان میں تمدنی یکجہتی کا فقدان ہے تو بھلا گروہی بیداریاں اور وفاداریاں کس طرح ایک کل ہند قوم کو پیدا کر سکتی ہیں؟۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان ہندوستانی قومی تخیل لوگوں کی زندگی میں جذبہ وطنیت کے پیدا کرنے سے قاصر رہا جو دراصل

قومی زندگی کی روح تصور کی جاتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی زندگی خود مرکزی گروہی تخیلات اور وفاداریوں سے متاثر رہی اور رہتی ہے۔۔ یہی موجودہ ہندوستان کا مسئلہ ہے اور جب تک اس کا حل نہیں ہوتا اس وقت تک ہندوستان کے تخیلات اور اس کی سرگرمیاں قومی نہیں سمجھی جا سکیں۔ اس کی یہی اہم ترین دشواری بھی ہے۔ ہندوستانی قوم کی تشکیل میں تمدنی اتحاد اور سیاسی اتفاق لازم ہے نہ کہ گروہی فرقہ واریت جس کا بھوت آج ہندوستان کے سر پر سوار ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سیاسی کشمکش دراصل اس کے قلبی اضطراب کا مظاہرہ ہے جس میں قومی عناصر کے اتحادی اور تمدنی قوتوں کی کمی ہے۔ قومی ہندوستان کو موجودہ فرقہ واری اصول زندگی کو خیرباد کہنا ہی نہ ہوگا بلکہ قومی اصولوں کو اپنے میں سمونا بھی ہوگا۔ یہی راہ ہمارے ملک کے نجات کی ہوگی۔